ن م راشد اور عہدِ جدید کا انسان

مُبین مرزا

Mubeen Mirza elaborates his own view of Rashed's portrayal of the modern man, who is not influenced by Western standards but is purely directed by Eastern values. His protagonist is the new man of the east clashing with his own past, in not just the material, but also the intellectual and spiritual context.

جدید اردو شاعری میں راشد پہلا شاعر ہے جو ہمارا تعارف عہدِ جدید کے انسان سے کراتا ہے— اور یہ تعارف اتنا جامع اور بھرپور ہے کہ ہم جدید انسان کی شخصیت کے ظاہری خدوخال ہی سے نہیں بلکہ اس کے مزاج کی کیفیات، فکری تصورات، وجودی مطالبات کے ساتھ ساتھ اُس کے روحانی تجربات تک سے واقف ہو جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس تعارف کے نتیجے میں اس جدید انسان سے ہم اپنے عصر کی انسانی صورتِ حال کا ربط قائم کرنے اور اس تناظر میں اپنی زندگی کی معنویت بھی اخذ کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرتے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ جدید اردو شاعری کے تناظر میں یہ اعزاز راشد کے سوا اس طور سے کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آتا۔

جب ہم یہ بنیادی بات جان لیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں دو سوالوں سے دوچار ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ آخر عہدِ جدید کا یہ انسان ہے کیا؟ اور دوسرے یہ کہ راشد کو اس کے تعارف کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ دونوں سوالات یوں تو پوچھنے کو بہت سادگی سے پوچھ لیے گئے ہیں

لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے پہلے سوال کا جواب معلومہ انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور تغیر آشنا صدی یعنی بیس ویں صدی کی بدلتی ہوئی انسانی صورتِ حال کا احاطہ کرتا ہے اور دوسرا سوال ہمارے شعر و سخن کے اس موڑ سے متعلق ہے جس کے بعد ہمارے ادب کے موضوعات اور افکار ہی نہیں بلکہ پیرایۂ اظہار اور اسلوبِ بیاں تک بہت کچھ بدل گیا۔

خواتین و حضرات! یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ ہم سب زندگی کی حقیقتوں، کائنات کی صداقتوں حتیٰ کہ مسلمات کی نوعیّتوں کو بھی اپنے تجربے کی روشنی میں جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنے احوال کے آئینے میں اُن کا جو عکس ہمیں نظر آتا ہے اُسی کو بنیاد بنا کر ہم اُن کی توجیہ کرتے ہیں اور پھر اپنے تعصّبات اور ترجیحات کی تناظر میں ان کی درجہ بندی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ سو آج کی اِس نشست کے لیے مجھ سے یاسمین حمید صاحبہ نے جب مقالہ لکھنے کی فرمائش کی تو مجھے ایک لمحہ بھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی — اور میں نے بلا تأمل آمادگی کا اظہار کر دیا۔ میں نے سوچا کہ راشد سے تو میرا دیرینہ رشتہ ہے۔ ان کی شاعری کے توسط سے ایک عالمِ خیال و مثال میں ن م راشد کے ساتھ میں نے بہت سا وقت گزارا ہے، باتیں کرتے ہوئے، انھیں سنتے ہوئے، ان سے کچھ پوچھتے ہوئے، کبھی اُن سے اُلجھتے ہوئے اور کبھی اُن سے احترام اور محبت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے — تو جس شخص سے آپ کے اتنے گہرے اور دیرینہ مراسم ہوں اُس کی بابت کوئی بات کرتے ہوئے آپ کسی تأمل اور تذبذب کا شکار بھلا کیوں ہوں گے۔ دیکھیے آدمی اپنے بارے میں کس قدر خوش فہم ہوتا ہے اور کس درجہ خوش گمانی سے کام لیتا ہے۔ بہر حال، میں اپنے بارے میں چاہے کسی بھی خوش فہمی میں تھا لیکن یاسمین حمید صاحبہ امورِ منصبی کی بجا آوری میں کوئی risk لینے کو تیار نہ تھیں، چنانچہ وہ وقفے وقفے سے فون کر کے مضمون لکھنے کی بابت مجھ سے دریافت کرتی رہیں۔ تو اب یوں ہے کہ یہ جو کچھ بھی میں آپ کے سامنے پڑھ رہا ہوں، اگر اس کا کوئی کریڈٹ ہے تو وہ یاسمین صاحبہ کو جاتا ہے کہ انھوں نے مجھے منہ زبانی دانش وری بگھارنے سے باز رکھا اور لشٹم پشٹم ہی سہی راشد پر یہ مضمون بہر حال لکھوا لیا۔ اور ہاں اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے یعنی اس مضمون کا کوئی discredit ہے تو وہ بھی انھی کا حصّہ ہے

کہ انھوں نے ایک صحیح کام کے لیے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔

خیر، تو میں عرض کر رہا تھا کہ راشد صاحب کے ساتھ مجھے یک گونہ قرب میسر رہا لیکن اس تعلق کی ابتدا کا واقعہ بھی دل چسپ ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ لگ بھگ تیس برس پہلے جب میں اور میری نسل کے دوسرے لوگ کوچۂ ادب کے طلسمات میں داخل ہوئے تو راشد صاحب اس قفسِ عنصری سے آگ کے رتھ پر سوار ہو کر رخصت ہو چکے تھے۔ اور اُن دنوں کہ جب ہم نے ہوش سنبھالا اس واقعے کی ادب کے کم و بیش سارے ہی ایوانوں میں بڑی گونج تھی۔ کہیں تعجب کے ساتھ، کہیں تاسف کے ساتھ، کہیں تحقیر کے ساتھ، کہیں حزنیہ لے میں اور کہیں گومگو کی کیفیت میں۔ میری پرورش چونکہ ایک روایتی مسلمان خاندان میں ہوئی ہے، اس لیے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا ہوگا کہ راشد صاحب نے کہا تھا کہ موت کے بعد انھیں سپردِ خاک نہ کیا جائے بلکہ نذرِ آتش کیا جائے، اور یہ کہ ان کے انتقال کے بعد ان کی اسی خواہش پر عمل بھی کیا گیا، تو میرے روایتی مسلمان اور نوجوان ذہن کو اس بات سے کیسا دھچکا لگا ہوگا، اور مجھے راشد صاحب پر کس قدر غصہ آیا ہوگا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اپنے انتہا پسند مزاج کی وجہ سے راشد صاحب سے ساری عمر خفا رہتا اور صلح صفائی پر آمادہ ہی نہ ہوتا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا قول ہے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔

یوں ہوا کہ ایک روز ایک کرم فرما نے راشد صاحب سے رنجیدہ خاطری کا اظہار کرتے ہوئے پا کر مجھ سے دریافت کیا، تم نے راشد کو کتنا پڑھا ہے؟ میں نے اس وقت تک راشد کو برائے نام اور رواروی میں پڑھا تھا بالکل اُسی طرح جیسے اکثر نوجوان بہت سے سنجیدہ کام عام طور پر غیر سنجیدگی سے کیا کرتے ہیں لیکن نوجوانی میں آدمی میں دو بے مثال خوبیاں ہوا کرتی ہیں، ایک یہ کہ وہ شرمندگی کی باتوں کو بھی بغیر شرمندہ ہوئے قبول کرنے کی ہمت رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ تعصب اور غصہ اس کے اندر گہری بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا۔ سو میں نے اعتراف کیا کہ میرا راشد سے تعارف برائے نام ہے۔ تب اُس مہربان نے کہا کہ اچھا تو پھر آج تمھاری راشد صاحب سے

ملاقات کراتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ حضرت اٹھے اور گھر کے اندر چلے گئے۔ لوٹے تو ان کے ایک ہاتھ میں طشتری تھی جس میں چائے کی دو پیالیاں اور کچھ میٹھا تھا جب کہ دوسرے ہاتھ میں راشد کے تین مجموعے، ''ماورا''، ''ایران میں اجنبی'' اور ''لا = انسان''۔ اب تو خیر میں چائے کبھی پھیکی اور کبھی اس میں شکر بہ قدرِ اشکِ بلبل ڈال کر پیتا ہوں لیکن اُن دنوں افتخار عارف صاحب کی طرح مجھے میٹھے سے خوب رغبت تھی اور میں بھی میٹھے سے خصوصی شغف کا اظہار کرنا ہر صحت مند اور خوش ذوق آدمی کے لیے لازمۂ حیات گردانتا تھا۔ لہٰذا اگر میسر ہو تو صرف چائے ہی میں نہیں بلکہ چائے شروع کرنے سے پہلے اور ختم کرنے کے بعد بھی، میں افتخار عارف صاحب کی طرح میٹھا شوق سے بلکہ یوں کہیے کہ دل لگا کر کھایا کرتا تھا۔ سو اُس وقت بھی یہی کر رہا تھا اور میرے میزبان دھیرج کے ساتھ ن م راشد کی نظمیں پڑھتے جاتے تھے۔ ان کی نگاہیں ٹھہر ٹھہر کر میرے چہرے کی طرف اٹھتی تھیں۔ میں وہ نظمیں اپنے تئیں تو دھیان ہی سے سن رہا تھا لیکن شاید میرا چہرہ کسی گہرے تاثر سے عاری تھا۔ تب میرے میزبان نے گھڑی بھر کو تامل کیا اور بولے، ''بھئی عجیب نظم ہے یہ۔ اہلِ مغرب sense and sensibility کی بہت بات کرتے ہیں ذرا دیکھو کس طرح بنتی ہے آدمی کی sensibility۔ اور پھر انھوں نے وہ نظم شروع کی۔ اب یہ ہوا کہ نظم آگے بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ میرا دورانِ خون بھی تیز ہوتا جاتا تھا اور جب وہ ان مصرعوں تک آئے:

دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل
سرگرانی کی شبِ رفتہ سے جاگ
کچھ شرر آغوشِ صرصر میں ہیں گم
اور کچھ زینہ بہ زینہ شعلوں کے مینار پر چڑھتے ہوئے
اور کچھ تہہ میں الاؤ کی ابھی
مضطرب، لیکن مذبذب طفلِ کم سن کی طرح
آگ زینہ، آگ رنگوں کا خزینہ
آگ ان لذات کا سرچشمہ ہے

جس سے لیتا ہے غذا عشاق کے دل کا تپاک
چوبِ خشک انگور، اس کی مے ہے آگ
سرسراتی ہے رگوں میں عید کے دن کی طرح!
آگ کاہن، یاد سے اُتری ہوئی صدیوں کی یہ افسانہ خواں
آنے والے قرنہا کی داستانیں لب پہ ہیں
دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل سن کر جواں

آگ آزادی کا، دلشادی کا نام
آگ پیدائش کا، افزائش کا نام
آگ کے پھولوں میں نسریں، یاسمن، سنبل، شقیق و نسترن
آگ آرائش کا، زیبائش کا نام
آگ وہ تقدیس، دُھل جاتے ہیں جس سے سب گناہ
آگ انسانوں کی پہلی سانس کے مانند اک ایسا کرم
عمر کا اک طول بھی جس کا نہیں کافی جواب!

(دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل)

یہ مصرعے سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کا سارا خون میرے سر میں جمع ہو گیا ہے۔ صحرا میں اٹھتے بگولوں کی سی کیفیت میرے دماغ میں برپا تھی۔ اس کیفیت کو ہیجان، سنسنی، وحشت، غصہ، خوف یا تھکن جیسا کوئی ایک نام دینا مشکل ہے۔ وہ جو کچھ بھی تھا، ان سب چیزوں کا مجموعہ تھا۔ میرے میزبان نے میری کیفیت کو بھانپ لیا۔ کہنے لگے، ''لو بس ایک نظم اور سن لو۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔ انھوں نے نظم کا عنوان بتایا اور نظم شروع کی:

جہاں زاد، نیچے گلی میں ترے در کے آگے

یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطّار یوسف
کی دُکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی
تھی میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاںؔ زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!
یہ وہ دور تھا جس میں، میں نے
کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا—
وہ کوزے مرے دستِ چابک کے پتلے
گل و رنگ و روغن کی مخلوقِ بے جاں،
وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے
"حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟"
وہ ہم سے— خود اپنے عمل سے
خداوند بن کر خداؤں کے مانند ہے رُوئے گرداں!"

جہاں زاد نو سال پہلے
تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے— حسن کوزہ گر نے
تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی

کہ جس سے مرے جسم و جاں
ابر و مہتاب کا رہگزر بن گئے تھے
جہاںؔ زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رُودِ دجلہ کا ساحل
وہ کشتی، وہ ملّاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود
اس کی جاں اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو اُبھرا نہیں ہے

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاںؔ زاد لیکن
تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر
وہی کوزہ گر جس کے کوزے تھے ہر کاخ و کو اور ہر شہر و قریہ کی نازش
تھے جن سے امیر و گدا کے مساکن درخشاں
تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاںؔ زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب
گل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب
معیشت کے اظہارِ فن کے سہاروں کی جانب
کہ میں اُس گل و لا سے، اُس رنگ و روغن

سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے

دلوں کے خرابے ہوں روشن!

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن

(حسن کوزہ گر)

خواتین و حضرات — تقویمِ ماہ سال کہتی ہے کہ یہ واقعہ کم و بیش تین دہائی پہلے کا ہے لیکن مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تین صدی پہلے کا ہے یہ واقعہ یا شاید تین ہزار سال پہلے کا— اور بس تبھی سے میں یہ نظم سن رہا ہوں، سنے چلا جا رہا ہوں— اور اب میں راشد سے اپنے اُس جان لیوا اختلاف سے دستبردار ہو چکا ہوں— اور اس کے بعد سے مسلسل سرخوشی کے ساتھ راشد صاحب سے مل رہا ہوں— اور ان کی جہاں زاد سے مل رہا ہوں۔ اُسی جہاں زاد سے جو زندگی کی، ایک مضطرب دل کی، ایک جستجو، ایک عشق کی، جوہرِ حیات کی اور شکستِ ممات کی تمثیل ہے۔ جو تمنا کی وسعت کا استعارہ ہے، مجھ ایسے خستہ جاں کے لیے رُودِ دجلہ کا کنارہ ہے اور جس سے مرے دل کے خرابے کو روشنی ملتی ہے۔ روشنی جو زندگی ہے۔

جنابِ صدر میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ایک تھیسس قائم کیا تھا یہ کہ راشد نے ہمارا تعارف عہدِ جدید کے انسان سے کرایا ہے اور اُس کے بعد دو سوالات دریافت کیے تھے۔ گفتگو کے اس مرحلے پر میں ان سوالوں کی طرف لوٹتا ہوں۔ پہلا سوال تھا کہ آخر عہدِ جدید کا انسان کیا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لیے ہمیں اس سے قبل ایک اور سوال پر غور کرنا ہے، یہ کہ خود یہ عہدِ جدید کیا ہے؟ سو اتنی بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ modern age یا modern era کی اصطلاح ادب میں سیاسیات اور فلسفے کے ذریعے آئی ہے اور ہم نے اور بہت سی دوسری چیزوں کی طرح یہ اصطلاح، اس کا معنیٰ، اس کے تناسبات اور اطلاقات کی صورتیں مغرب سے لی ہیں اور اس پر برا ماننے کی کیا بات ہے، ہم نے تو عہدِ جدید بھی مغرب ہی سے لیا ہے۔ کلیسا کی اتھارٹی کا چیلنج ہونا، تہذیبِ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ جسے ہم رینے ساں کے نام سے جانتے ہیں، فرد کی آزادی، مساوی انسانی حقوق کا نعرہ، اقتدارِ اعلیٰ سے خدا کی معزولی، نظریوں اور فلسفوں کے بعد خود انسان

مرکزِ کائنات کا تصور غرض مغرب کے پاس تو کیا کیا جواز نہ تھا عہدِ جدید کا غلغلہ بلند کرنے کے لیے— لیکن میں سوچتا ہوں کہ ہم کس برتے پر اس میدان میں اُترے تھے اور کس پونجی کے سہارے ہم نے مصر کے بازار کا رُخ کیا تھا؟ خیر، یہ ایک الگ بحث ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تھیں وہ بنیادیں جن کے بل پر مغرب نے عہدِ جدید میں قدم رکھا۔ پھر دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ عہدِ جدید کا کیا کیا نہ استقبال ہوا۔ مغرب ہی میں نہیں بلکہ خود ہمارے یہاں بھی۔ وہی عہدِ جدید جس کے بارے میں فرانس کے عظیم دینی مفکر رینے گینوں نے اپنی معروف کتاب Crisis of the Modern World میں کہا کہ عہدِ جدید مغرب میں ایک طوفان کی طرح آیا ہے— اور ہم اس طوفان کے آگے کوئی بند باندھ سکتے ہیں نہ ہی اسے کسی اور طرح روک سکتے ہیں کہ ایسا اصولِ تکوین کے تحت ہو رہا ہے یعنی انسانوں، معاشروں اور تہذیبوں کی تقدیر کے تحت۔ جی ہاں یہ وہی عہدِ جدید ہے جس کے لیے مارٹن لنگز نے اپنی کتاب Ancient Beliefs and Modern Superstitions میں لکھا کہ قدیم معاشروں کے روایتی انسان کے پاس یقین کی دولت تھی اور عہدِ جدید کے انسان کے پاس بے یقینی اور توہمات ہیں۔ وقت اس گفتگو کی تفصیلات میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں مغرب کو چھوڑ کر مشرق کی طرف لوٹتا ہوں۔ اُسی مشرق کی طرف جو سلیم احمد مرحوم کے بہ قول ہار گیا۔ تب میں سوچتا ہوں کہ آخر مشرق کیوں ہار گیا؟ آدمی میں بھی کیا کیا کمزوریاں ہوتی ہیں، دُکھ کے ہر تجربے کو کس قدر سادہ لوحی سے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مشرق کی ہار کا سوال مجھے مسلسل تکلیف دیے جاتا ہے۔ اور پھر میری ملاقات اقبال سے ہوتی ہے۔ اے ہمالہ، اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں، لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری، قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے، رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر سے گزرتے گزرتے میں:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

تک آ پہنچتا ہوں، تب مجھ پر کھلتا ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب کے تصادم کو گرفت کیا ہے۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ مشرق و مغرب کا تصادم تو راشد کے یہاں بھی پوری شدت سے

ابھرتا ہے لیکن اقبال کی طرح اس کا سیاق و سباق روحانی اور تہذیبی نہیں بلکہ اس کے برعکس سیاسی اور مادّی ہے — اور وہ اس لیے کہ جدید انسان کا سارا سروکار اور اس کے تمام تر مسائل انھی دو بنیادوں پر استوار ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے بہ قول راشد کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اپنی روح کو سیاسی اور مادّی مسائل اور نظریوں کے پاس رہن نہیں رکھا۔ یہ واقعی بہت اہم بات ہے۔ اس کے علاوہ ایک معاملہ اور ہے جو ہم سے توجہ چاہتا ہے۔ دیکھیے عجیب بات ہے کہ ساری جدت طرازی، بغاوت، سیکولرزم اور کایا کلپ کے باوجود راشد کے اندر سے روایتی اور مشرقی آدمی رخصت نہیں ہوا ہے، بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے یہ آدمی ایک slumber میں چلا جاتا ہے اور راشد کو آزاد چھوڑ دیتا ہے لیکن راشد جب بھی اپنے شعری تجربے میں ان مسائل کی طرف پلٹتے ہیں جو مشرقی تہذیب، اس کی اقدار، اس کے نظامِ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ آدمی یک بہ یک جاگ اٹھتا ہے اور راشد کے قوائے ذہنی پر ہی نہیں بلکہ ان کے جذباتی رویوں اور دلی احساسات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ 'میں اُسے واقفِ الف نہ کروں'، 'عہدِ وفا'، 'گناہ اور محبت' ایسی نظموں میں عشق کے وہی افلاطونی خیالات جو مشرق کے مخصوص ذہنی رُجحان سے عبارت سمجھے جاتے ہیں، ایک زیریں لہر کی طرح مسلسل چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ جدید انسان کی ساری جبلی کاوشیں اور اس کا مطمحِ حیات بھی راشد کو گریز کے مضمون سے نکلنے نہیں دیتا۔ یہی نہیں بلکہ 'بے کراں رات کے سناٹے میں' اور 'انتقام' میں تو راشد نے وحشت کی منہ زور قوتوں کو جس تقابل اور تضاد کے رو بہ رُو لا کھڑا کیا ہے، وہ فنی سطح پر چاہے بلند نہ ہو لیکن شاعر کے جس ذہنی رویے کی غمازی کر رہا ہے، کیا اُسے آخری نتیجے کے طور پر مغرب کا پروردہ یا مکمل جدید انسان کہا جا سکتا ہے — میرا خیال ہے کہ نہیں۔

چلیے یہاں تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ راشد کی تشکیل و تدوین کا زمانہ تھا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ 'سبا ویراں'، 'دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل'، 'حسن کوزہ گر' اور 'میرے بھی ہیں کچھ خواب' ایسی نظمیں جو صرف راشد ہی کے فن کی بلندی کا معیار نہیں ہیں بلکہ اردو شعر و سخن کی پوری تہذیب میں جو اپنے فکری نقوش، تزئینِ جمال اور آرائشِ خیال کے اعلیٰ تر معیارات کی سند قرار پاتی ہیں

ان میں روایتی مشرقی آدمی اور جدید آدمی کے باہمی تصادم کی جیسی بے پناہ صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں وہ بھلا راشد کے معاصرین اور جدیدیت کے دوسرے بنیاد گزاروں میں کس کے یہاں ریکارڈ ہوئی ہیں — اور غور طلب بات یہ ہے کہ روایتی اور جدید آدمی کا یہ تصادم خالص existential اور sensuous سطح سے لے کر اعلیٰ تر ذہنی و فکری بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ روحانی مسائل سطح تک راشد کے شعری تجربے میں معرضِ اظہار میں آیا ہے۔ باہم مقابل کھڑی ہوئی سچائیوں کو یوں سمیٹنا ہما شما کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ راشد کی آنکھوں سے اگر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ مشرق لیلیٰ و مجنوں اور وامق و عذرا کو پھر سے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے تو اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ مغرب کے لیے تو رومیو جیولیٹ اور انطونی قلوپطرہ اب محض قصہ کہانی سے زیادہ حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ نئی دُنیا کنزیومرزم کی دُنیا ہے۔ تاجر اور صارف کی دُنیا ہے اور یہاں جو کچھ ہے بہ شمول جذبے اور مراسم سب کچھ فروختنی ہے اور سب کچھ مرئی ہے اور آج کے عہد کی سچائی صرف tangible reality ہے — لیکن اسی سفاک صارفیت کی دُنیا میں راشد غیر مرئی حقیقتوں کو بڑا سمجھتے ہیں، وہ جہاں زاد کی آنکھوں کی تاب ناکی کے اَسیر ہیں، اُنھیں آرزو راہبہ نظر آتی ہے اور اس راہبہ کے دل میں جلتی ہوئی شمعِ امید بھی وہ دیکھ لیتے ہیں، وہ تمنا کے ژولیدہ و نادیدہ تاروں سے خود تو واقف ہیں ہی مگر اہلِ مریخ کو بھی ژولیدہ بانہوں، محبت میں سرخوش نگاہوں اور آدمی کے گناہوں کے رنگ دکھانا چاہتے ہیں۔

خواتین و حضرات، مضمون کی طوالت کی وحشت نے مجھے مثالوں سے حتی الوسع گریزاں رکھا ہے لیکن ذرا یہ ٹکڑے تو دیکھتے ہی چلیے:

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
کچھ خواب کہ مدفون ہیں اجداد کے خود ساختہ اسمار کے نیچے
اُجڑے ہوئے مذہب کے بنا ریختہ اوہام کی دیوار کے نیچے

شیراز کے مجذوبِ تنک جام کے افکار کے نیچے
تہذیبِ نگوں سار کے آلام کے نیچے
(میرے بھی ہیں کچھ خواب)

ایک اور نظم کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
اَن کہی سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی، اُس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو!
(زندگی سے ڈرتے ہو؟)

اور ذرا یہ ٹکڑا دیکھیے:

چار سُو دائرے ہیں، دائرے ہیں، دائرے ہیں

حلقہ در حلقہ ہیں گفتار میں ہم
رقص و رفتار میں ہم
نغمہ و صورتِ اشعار میں ہم
کھو گئے جستجوئے گیسوئے خم دار میں ہم
عشقِ نارُستہ کے ادبار میں ہم
کتنے عشاق سرِ راہ پڑے ہیں گویا
شبِ یک گانہ و سہ گانہ و نُہ گانہ کے بعد
(اپنی ہر ''سعی'' کو جو حاصلِ جاوید سمجھتے تھے کبھی!)
اُن کے لب پر نہ تبسم نہ فغاں ہے باقی
اُن کی آنکھوں میں فقط سرِ نہاں ہے باقی!
(ہم کہ عشاق نہیں...)

یہ غور طلب مقام ہے کہ یہ عشقِ ازل گیر و ابد تاب، یہ زندگی کی آگہی، یہ تجرباتِ وجود کا حاصل کہ لب پر تبسم نہ فغاں اور یہ آنکھوں میں ٹھہرا ہوا سرِ نہاں کہ جسے اصلِ حیات و ممات کہیے——یہ سارا سامان تو احساسات و جذبات اور فکر و دانش کا سرمایہ ہے، وہ سرمایہ جو انسان کے دل کو عطا ہوتا ہے اور اس کی روح کو مالا مال کرتا ہے، اور اِدھر مغرب کے جدید آدمی کی ساری تگ و تاز اسی بارِ گراں سے نجات کے لیے تو ہے۔ King of the Castle اور Islam and the Destiny of Man کے مصنف گائے ایٹن کئی برس پہلے لاہور آئے تھے۔ اُن سے سوال کیا گیا، آپ نے جب اسلام قبول کیا تو آپ کو مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی سطح پر بہت کچھ چھوڑنا پڑا ہوگا، آپ کو کیسا لگا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کچھ نہیں چھوڑنا پڑا۔ اس لیے کہ میرے پاس چھوڑنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ حقیقت میں مغرب کے آدمی کے پاس یوں تو بہت پہلے سے کچھ نہیں ہے چھوڑنے کے لیے اور جدید آدمی کے پاس تو بالکل ہی کچھ نہیں ہے۔ نہ مذہب، نہ تہذیب اور نہ ہی معاشرتی و اخلاقی اقدار——راشد کا یہ جدید آدمی بھلا پھر مغرب کا جدید آدمی کیوں کر ہو سکتا ہے۔

ہاں ایک بات مجھے محسوس ہوتی ہے یہ کہ راشد دراصل تصادم کا شاعر ہے اور اس کا یہ تصادم ہشت پہلو ہے۔ شاعر کا اپنے معاشرے سے تصادم، اس کے اخلاقی نظام سے تصادم، اپنے عہد کی انسانی صورتِ حال سے تصادم، کائنات اور اس کے مظاہر سے تصادم حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے تصادم اور اس سے بھی آگے عقیدے سے، تقدیر سے اور خدا سے تصادم۔ راشد نے زندگی اور اُس کی حقیقتوں کو تصادم کے اس سلسلے میں دریافت کیا ہے۔ یہی تصادم راشد کو جدید عہد اور اس کے انسان کی آگہی عطا کرتا ہے، اس کے وجودی کرب اور روحانی اضمحلال کا احوال راشد پر افشا کرتا ہے— اور پھر یہی احوال اُسے زندگی کا اور اس کی قلبِ ماہیت کرنے والی افتاد کا سامنا کرنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ کرشن چندر نے ''ماورا'' کے دیباچے میں راشد کو زندگی سے فرار کا شاعر قرار دیا تھا۔ کرشن چندر کی اس بات کا جب بھی دھیان آتا ہے، مجھ سے ہنسی ضبط کرنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ اپنی انگلیوں کی پوروں تک زندگی سے لبالب بھرے ہوئے شخص کو زندگی سے فرار کا الزام دینا کیسی بے مثال سادگی کا مظاہرہ ہے۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ ہے کہ زندگی کی مثال مٹھی کی ریت کی سی ہوتی ہے کہ پھسلتی چلی جاتی ہے، پھسلتی چلی جاتی ہے اور پتا اس وقت چلتا ہے جب ہاتھ بالکل خالی ہو جاتا ہے— لیکن یہ بھی آدمی یا زندگی کی شکست تو ہرگز نہیں ہے— اس لیے کہ جب ہم مٹھی کھول کر دیکھتے ہیں تو اس میں ریت بے شک نہیں ہوتی لیکن ہتھیلی پر چمکتے ہوئے کچھ ذرّے، کچھ لمحے، ہمیں ضرور مل جاتے ہیں— بس یہی ذرّے، یہی لمحے تو زندگی کا حاصل ہیں— زندگی کا حاصل بھی اور شاعری کا حاصل بھی۔

اور ن م راشد کی مٹھی میں، ان کی شاعری میں، ان ذرّوں کے ہونے کی گواہی ہماری آنکھیں بھی دیتی ہیں اور ہمارا دل بھی۔